حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

ریاض انور کی نظم نگاری
Poetry by Riyaz Anwer

*محمد نعمان علوی
**شکیل حسین
***ڈاکٹر حماد رسول
*ایم فل اسکالر شعبہ اردو بہاالدین زکریایونیورسٹی ملتان
**اسسٹنٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ ملت گریجویٹ کالج ملتان
***استاد شعبہ اردو بہاالدین زکریایونیورسٹی ملتان

Abstract:
Whirlpool of Voices is a long poem about East Pakistan. It is a story of wonder, sincerity and sorrow that Riaz Anwar has completed with years of hard work and dedication. This poem is based on a deep sense of nationalism. He sees the enchanting scenery and extreme poverty of East Bengal. Manjhi's songs that resonate with the changing landscapes of the rivers of Bengal and men, women and children dressed in torn old clothes teach him the greatness of love with their own eyes. However, for their part, only the severe hunger that has persisted since the time of the Bengal famine has come.

Key Words: Urdu Poetry, East Pakistan, Bengal Famine, Civilization and Culture

آوازوں کا بھنور مشرقی پاکستان کے متعلق ایک طویل نظم ہے یہ حیرت، خلوص اور دکھ کی ایک کہانی ہے جسے ریاض انور نے برسوں کی ریاضت اور محنت سے مکمل کیا ہے۔ یہ نظم قومیت کے گہرے شعور پر مبنی ہے۔ وہ مشرقی بنگال کے سحر انگیز مناظر اور بے پناہ غربت کو چشم تماشا وا کر کے دیکھتے ہیں۔ ماںجھیوں کے گیت جو بنگال کے دریاوں میں وقت بدلتے ہوئے مناظر کے ساتھ گونجتے ہیں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مرد عورتیں اور بچے اپنی آنکھوں سے اُسے پیار کی عظمت کا سبق پڑھاتے ہیں۔ حالانکہ خود اُن کے حصے میں صرف وہ شدید بھوک آئی ہے جو قحط بنگال کے زمانے سے وہیں ٹھہری ہوئی ہے۔

کلیدی الفاظ: اُردو نظم، مشرقی پاکستان، قحط بنگال، تہذیب وثقافت

اُردو شاعری میں غزل کی حیثیت مسلم ہے تاہم اُردو نظم جو انیسویں صدی کے نصف آخر سے باضابطہ شروع ہوئی غزل کی سرفراز حیثیت کے مقابل نظم بھی قد کاٹھ کے ساتھ موجود رہی ہے۔ اس صنف کو رواج عام بخشنے والوں میں آزاد کا نام سرفہرست ہے محمد حسین آزاد کے ذہن وفکر کو داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے شاعری کی فرسودہ روایت کو زمانے کے تقاضے سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جدید شاعری کو ایک تحریک دی اور "انجمن پنجاب" کو آلہ کار بنایا۔

محمد حسین آزاد نے مختلف جلسوں میں شاعری سے محرکات اور رویے کی وکالت کی۔ ان مشاعروں کی غرض وغایت یہ تھی کہ اُردو شاعری کو تقلید کے دائرے سے نکال کر کھلی فضاء میں لایا جائے اور مواد وہیت کے اعتبار سے وسعت اور شاعری میں علمیت اور افادیت کا رنگ پیدا کیا جاے، مبالغہ، انفعالیت اور قنوطیت کی جگہ حقیقت، رجائیت اور فعالیت سے ہم کنار کیا جاے۔ آزاد اُردو شاعری کو تقلید کے دائرے سے نکالنے کے ساتھ انگریزی ادب سے رجوع کرنے کا کا مشورہ دیتے ہیں۔ آزاد کی اس تحریک کی تائید سرسید اور ملک کے دوسرے ادیبوں نے کی کہ اُردو شاعری کو حسن وعشق کی قید سے آزاد کیا جائے۔ حالی نے آزادی کی ہم نوائی کی اور مشاعروں کے لیے نظمیں لکھیں۔ حالی نے اپنا دیوان مرتب کرتے ہوئے شاعری کے جواز میں جو مقدمہ تحریر کیا سرسید اور آزاد کے ان ادبی تصورات کو ہی دلائل کے ذریعے فکری پس منظر عطا کیا۔ ان خیالات کا ایک اہم محرک سیاسی اور نفسیاتی تھا۔ اس لیے کہ 1857ء کی تحریک آزادی میں شکست کے بعد انگریز جس قوت اور برتری کے احساسات کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہوئے اس سے عام لوگوں میں اپنی تہذیب کے متعلق احساسِ کمتری پیدا ہو چلا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام بالخصوص اس کا دانشور طبقہ اپنی تمام تہذیبی، فکری

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

اور ادبی روایت کو انگریزی تہذیب اور ادب کے مقابلے میں کم تر سمجھنے لگا۔ جب آزاد انگریزی ادب سے واجبی سی واقفیت رکھنے کے باوجود کہہ سکتے ہیں کہ "اب تمہارے خلعت وزیور پرانے ہوگئے مگر نئے انداز کے خلعت وزیور جو آج کے مناسبت حال ہیں وہ انگریزی صندقوں میں بند ہیں"، تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہمارے دانشور نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان حضرات نے اُردو کے قدیم ادبی سرمایے سے بیزاری ظاہر کی اور ادیبوں کو نئے خیالات دوسرے لفظوں میں انگریزی خیالات قبول کرنے کی دعوت دی۔ حالی بھی یہی لکھتے ہیں: "حالی چلو کہ پیروی مغربی کریں" اور سرسید نے بھی نیچرل شاعری کے پہلے مشاعرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ اس انداز کا مشورہ دیا:

"اگر ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جائے گی"۔[1]

اس لیے حالی اور آزاد نے جو نظمیں لکھی ان کا دائرہ کار وہی تھا جسے کرنل ہالرائڈ نے طے کیا تھا۔ انجمن کے پہلے مشاعرے میں کرنل ہالرائیڈ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ:

"اُردو کی درسی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے ان میں اُردو نظم بالکل نہیں آپ اس بات پر غور کری کہ ہمارے دیہاتی مدارس میں ایک منتخبات اُردو نظم جس میں اخلاق و نصیحت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہو، درس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کیا اس قسم کا انتخاب سودا، میر تقی، ذوق یا غالب کی تصنیفات سے مرتب ہو سکے گا؟ تو دریافت کیا جا سکتا ہے کہ شعرائے زمانہ حال سے خاص مدارس کے لیے ایک ایسی تصنیف کا کام سر انجام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس طور پر مدارس سرکار کے وسیلے سے رواج ہو جائے اور واہیات نظم جو بالفعل بہت رائج ہے ختم ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہو گی"۔[2]

ابتدائی نظم گو شعراء پر روایتی صنعتوں قصیدہ مرثیہ اور مثنوی کا سایہ صاف نظر آتا ہے لیکن 1960ء کے بعد جدید نظم گو شعراء نے اپنی طویل نظموں کے واسطے ایک نئی شعریات وضع کرنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے ترقی پسند شعرانے پرانی ہیتوں کی بازیافت کے ساتھ نئی ہیئتوں کی تشکیل کا سلسلہ آگے بڑھایا تھا۔ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی کی طویل نظمیں، راشد، میراجی اور اختر الایمان کے بعد نمایاں ہونے والے شعرا کی نظمیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ طویل نظم کی روایت 1960ء کے بعد ایک نئے دور میں داخل ہوئی جس میں نظم گو شعرانے اپنی حسیت اور داخلی محرکات کو نئی سطح پر سمجھا اپنے باطن کی تفہیم کے نئے زاویے سے آشنا ہوئے ایسے تجربوں تک کی رسائی اور اس کا اظہار پرانی صنعتوں اور ہیئتوں پر قانع ہونے کی بجائے نئے اسالیب کی دریافت کا سبب بنا۔ 1960ء کے بعد بیشتر طویل نظمیں نئے شعراء کے وجدانی مطالبات کی تکمیل کے لیے نئے راستے تلاش کرتی ہیں۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

"1960ء کے بعد کی نظم میں طویل نظم سے شغف بہت نمایاں رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے یہ طویل نظم کی روایت میں سب سے زیادہ فنی تجربے پچھلے تیس پینتس برس میں ہی سامنے آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ طویل نظم کے واسطے سے ہمارے نظم گویوں کو اپنے باطن کی تفتیش و تفہیم کا ایک نیا زاویہ ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اپنی حیثیت، اپنی داخلی محرکات کو ایک نئی سطح پر سمجھنا چاہتے تھے"۔[3]

جدید اُردو نظم خصوصاً طویل نظموں کے حوالے سے سلیم احمد کی نظم "مشرق" جیلانی کامران کی "امتیاز" جعفر طاہر کی "ٹھٹھ" ضیا جالندھری کی "ہم" فہمیدہ ریاض کی "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے" رہبر رضوی کی "پرانی بات" اور وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد" اہم نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں جہاں موضوعات کے حوالے سے نیا پن ہے وہیں طرز اظہار اور اسلوب کے حوالے سے بھی شعراء نے تجربات کیے ہیں اُردو طویل نظم نگاری کے حوالے سے باقاعدہ فن یا کوئی ضابطہ مقرر نہیں۔ شعراء اپنے اظہار اور تجربات کی سہولت کے پیش نظر معیاری طریقہ اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

"دنیا کی عظیم شاعری اپنے دماغ کے اہم ترین موضوعات سے وابستہ رہی ہے۔ طویل نظم نے اس مطالبہ کو پورا کیا ہے۔ یہ وقت کے سنجیدہ اور اہم مسائل کو چھیڑتی ہے اور اس کا مزاج گیت اور غزل اور مختصر نظموں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ گیت کے مزاج میں لڑکپن کی شوخی اور معصومیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ غزل شباب کی دھڑکنوں ور واردات قلبیہ کی ترجمان ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی نظموں میں جبہ وستار کی حکومت ہوتی ہے۔ مختصر نظمیں سنجیدہ مزاج کے باوجود اپنے اختصار کے باعث اہم موضوعات کا بار برداشت نہیں کر سکتیں۔ طویل نظم فکر وخیال کی اس پختگی کی مظہر ہے جہاں جذبات کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ زندگی پر ناقدار نظر ڈالنے کا شعور بھی بیدار ہو جاتا ہے"۔[4]

مندرجہ بالا خصوصیات کے ساتھ ساتھ طویل نظم میں کچھ اور خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں بلکہ ان کی شمولیت لازمی ہے مثلاً طویل نظم اپنی علاقائی خصوصیات کے باوجود زمان ومکان کی پابندیوں سے بلند ہوتی ہے اس کا موضوع عام طور سے عصری مسائل سے چناجاتا ہے لیکن وہ موضوع زندگی کی پہنائیوں سے ہی برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے وقت گزرنے کے باوجود اس کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہی ہے۔

ریاض انور(1993-1931ء) جنوبی پنجاب کے علاقے دائرہ دین پناہ میں پیدا ہوئے۔ معروف محقق، نقاد، ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ہم مکتب (لیہ سکول) رہے۔ 1961ء میں بزم ثقافت ملتان کے پہلے جنرل سیکرٹری بنے۔ 1962ء میں رائٹر گلڈ صوبائی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ 1972ء میں پاکستان فاؤنڈیشن کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر تعینات رہے۔ اس عہد کے معروف ادبی پرچوں، ساقی نامہ، فنون، ادب لطیف نقوش اور ماہ نو میں اُن کا کلام شائع ہوا۔

طویل نظم کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اُن کا پہلا نظموں کا مجموعہ آوازوں کا بھنور 1968ء میں منظر عام پر آیا۔ مذکورہ عنوان کی طویل نظم مشرقی پاکستان کی تاریخ، تہذیب وثقافت کو موضوع بناتی ہے۔ نظم کا راوی خود شاعر ہے دوسرے کرداروں میں بھٹیالی اور بھوتر ہیں جو مشرقی پاکستان کی عوام کے دکھ سکھ، ہجر ووصال، صبر آزما جدوجہد کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔ نظم اپنے دامن میں مشرقی پاکستان کی ساری سندرتا، تہذیبی ورثہ، غم والم کو سمیٹ کر مشرقی پاکستان کی روح میں اتر جاتی ہے۔ شاعر ہمیں شاداب وادیوں، بل کھاتی، گنگناتی ندیوں اور خوبناک رومانوی فضاؤں سے اس سرکش وادی میں لے جاتے ہیں جہاں برہنہ روحیں کاغذی پیرہن پہنے فریاد کناں ہے لباس اور روٹی کے ساتھ جینے کا حق مانگتی ہیں۔

نظم کے ابتدائی حصے میں بنگال کی لوک ثقافت کو رومانوی انداز میں پیش کیا ہے شاعر نے بنگال کو ہریالے کھیتوں اور دریاوں کا دیس قرار دیا ہے۔ دریا، کشتی، مانجھی بنگلہ ثقافت کے ایسے حوالے ہیں جن کے بغیر بنگال کا کوئی بھی خاکہ نامکمل رہے گا۔ نظم کا یہ حصہ لوک گیتوں کی یاد دلاتا ہے۔ شاعر نے بنگلہ ثقافت کی پیش کش کیلئے ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جو کہ صوتی آہنگ رکھتے ہیں۔

"ہریالے کھیتوں کی دھرتی دریاؤں کا دیس / سوہنی اور ملہار کی نگری آشاؤں کا دیس / پدما کے سینے پر ہوائے نوکا ڈولے / رادھا ناچے بستی بستی گھونگھٹ کے پٹ کھولے / کالے بادل جھوم کے آئیں چھم چھم برکھا برسے / آم کی ڈال پہ کوئل کوکے من ساجن کو ترسے"۔[5]

نظم کے دوسرے تیسرے حصے میں ارضِ بنگال سے شاعر کی محبت اور عقیدت کا اظہار بہت خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس بند میں شاعر نے سرزمینِ بنگال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بہت خوابناک اور دلنشین ہے۔ 'جھومتے پیڑ، ہرے کنج، چمکتی سڑکیں، جگمگاتے ہوئے بازار، دہکتی گلیاں، رقص کرتی ہوئی لیلاوں کے بجتے گھنگرو، گیتوں کی پراسرار مہک، نور ونکہت سے تراشے ہوئے جسموں کی دمک، ان سب علامتوں سے ایسی فضا بنتی ہے جو کسی بھی دل کو مسحور کرنے کے لیے کافی ہے شاعر نے بنگال کی عورتوں کو تاج محل سے تشبیہہ دی ہے اس حصے میں [شاہ باغ] کی پراسرار فضا کو بہت دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔

"یہ ہے شہ باغ، بہکتے ہوئے رازوں کا امیں / شب جہاں جام بکف، نغمہ بلب آتی ہے / اس کے، مخمور وپراسرار شبستانوں میں / ساز و آواز کے منجدھار میں بہتے بہتے / جھومتی بانہوں میں یوں جسم مچل جاتے ہیں / جس طرح سینۂ افلاک پہ ساون رُت میں / برق کی لہر تڑپ جاتی ہے"۔[6]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

شاہ باغ کی خواب ناک فضا کے بعد نظم کے اس حصے میں 'دانش گاہ ڈھاکہ' میں 1951ء میں رونما ہونے والے واقعہ کا پر سوز اور اُداس کر دینے والا بیان ہے۔ بنگالی اپنے ملک ، قوم اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے بھی بہت محبت کرتے ہیں۔ بعض اوقات زبان کے ساتھ لگاؤ دوسرے تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے۔ 1951ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے بنگلہ زبان کو سرکاری زبان قرار دینے کے لیے جلوس نکالا جس پر ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے اِن طالب علموں پر لاٹھی چارج اور فائرنگ کروادی جس کے نتیجے میں کئی طالب علم شہید ہو گئے۔ ان شہدا کی یاد میں "شہید مینار" تعمیر کیا گیا۔ اب بھی ہر سال بنگلہ دیش کے طالب علم ان شہدا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس مینار کے آس پاس جمع ہو کر قومی یکجہتی اور اپنی زبان سے محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

"نوجوان باندھے ہوئے سر سے شہیدوں کے کفن / لڑکیاں ساری کے آنچل کو بنائے پرچم / ایک بپھرے ہوئے طوفان کی لہروں کی طرح / 'راشٹر وبھاشا بنگلہ' کا لگا کر نعرہ / ظلم کی آہنی دیوار سے ٹکرائے تھے / گولیاں کھا کے گرے قوم کے جیالے بیٹے / کھل اُٹھے راہگزاروں پہ لہو کے لالے / گرتے گرتے بھی پکار اٹھتے وہ لرزاں لب / راشٹر وبھاشا بنگلہ / راشٹر وبھاشا بنگلہ "۔[7]

نظم کے پانچویں حصے میں شاعر سفر نامہ نگار کا روپ دھار لیتا ہے اس حصے میں شاعر نے ڈھاکہ کے مختلف بازاروں، کوہساروں، ہوٹلوں اور وادیوں کا تعارف ایک سیاح کے طور پر کروایا ہے۔ بنگال کی تاریخ بھی پس منظر کے طور پر شاعر کے ذہن میں موجود ہے۔ انگریز، ہندوؤں اور مسلمان حکمرانوں کی طرف سے ڈھائے گئے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ ارض بنگال کو ہر دور میں ابن الوقت اور آمر حکمرانوں نے تختہ مشق بنایا ہے۔ ظلم اور بربریت کا شکار یہ سرزمین امن گیت گانے والوں سے بھی کبھی خالی نہیں رہی۔ یہاں شاعر نے "بہرام سقا" کی مثال پیش کی ہے۔

"وہ شاعر کیف ورنگ لمحات جذب میں / اپنے دل کی بے انت روشنی کو / خیال کا روپ دے / کے لفظوں کے چاند میں ڈھالتا رہا ہے / نہ جانے کیوں پھر بیاض کے ہر ورق کو دھو ڈھالتا رہا ہے / وہ شاعر دلنواز مشکیزہ تھامے نغموں کی روشنی سے / جہانِ تاریک میں اجالوں کا رنگ بھرتا ہے برسوں "۔[8]

نظم کے چھٹے حصے میں کسان اور دھان جو سرزمین بنگال کا ایک معروف حوالہ ہے ارض بنگال قدرتی آفات کی آماجگاہ رہی ہے کبھی پانی زیست کرنے کے سبھی سامان بہا کر لے جاتا ہے تو کبھی خشک سالی کھیتوں میں اُگی ہوئی فصلوں کو جلا دیتی ہے۔ قدرت بنگال کے کسان کا صدیوں سے امتحان لے رہی ہے شاعر نے قدرت کی ستم ظریفی اور بنگال کے کسان کے حوالے جو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جب خشک سالی کی وجہ سے فصلیں ریت بننے لگتی ہیں تو کسان 'میگھی راجا' کے حضور بارش کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

"اللہ میگھ دے / اللہ میگھ دے پانی دے چھایا دے دے توئی / اللہ میگھ دے / بیل کو باندھ کے کھیت میں بوڑھا چاشی نیر بہائے / تھک گئیں آنکھیں تکتے تکتے پر بادل نہ آئے / اللہ میگھ دے / اللہ میگھ دے پانی دے چھاے ادے دے کوئی / اللہ میگھ دے / خشک ہو کر کاڈل کے پتے شاخ سے گرتے جائیں / پانی پانی کہتے یہ دِن رات گزرتے جائیں "۔[9]

برسات کے سحر میں گرفتار ہو کر غریب مانجھی بھی کچھ دیر کیلئے اپنے دکھوں کو بھول گیا ہے۔ جگہ جگہ بزمِ یاراں سجی ہوئی ہے۔ ہر کوئی پر مسرت اور پر سکون ہے۔ سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے بانسری کی مدہم تال سنائی دے رہی ہے۔ فضا میں گیتوں کی سرسراہٹ ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ ہر سو بکھرے ہوئے ہیں۔ پچھلے قحط، وباؤں، اور باد و باراں کی داستانیں سنائی جا رہی ہیں کہیں کشتیوں کی دوڑ ہو رہی ہے۔ کہیں کبڈی کا شور برپا ہے۔ کہیں مزاروں پر جمگھٹے ہیں اور کہیں بیت بازی کی محفلیں جمی ہوئیں ہیں۔ ہرے بھرے کنج، بجتے نوکے، بہکتے رنگ اور مچلتے دریا میں ایسی مسحور کن فضا ترتیب دی ہے کہ زندگی کے حسن میں کچھ اور اضافہ کیا ہے۔

"گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بزمِ یاراں سجی ہوئی ہے / نفس نفس میں مسرتوں اور سکوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے / کسی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ، کسی کے ہونٹوں پہ بانسری ہے "۔[10]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

شاعر نے آٹھویں حصے میں منظوم تمثیلی ڈرامے کا اندازہ اختیار کیا ہے۔ پہلی آواز استفسار کرتی ہے دوسری آواز جواب دیتی ہے یہاں شاعر نے ایک کردار کے ذریعے سے سیلاب کی تباہ کاریوں کا نقشہ بڑی فنی چابکدستی، مہارت اور پر سوز انداز میں کھینچتا ہے سیلاب ہر چیز کو بہالے جاتا ہے مکانات، فصلیں، اور انسان تنکوں کی طرح عظیم لہروں کے ساتھ بہہ جاتے ہیں دریا کی لہریں خطے میں زندگی کے آثار معدوم کر دیتی ہے مگر اِس خطے کے لوگ اپنی مٹی کی محبت میں دوبارہ اپنی فصلیں اور گھروں کو نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ تعمیر کرتے ہیں اور یہی زیست اور موت کی کشمکش ارضِ بنگال کے رقص ونغمہ کی جان ہے۔

”افق سے گھٹا ڈھل گئی ہے، ہوا تھم گئی ہے / کراں تا کراں سنسناتی ہوئی خاموشی نوحہ خواں ہے / نہ کوئی مکیں ہے، نہ کوئی مکاں ہے / یہ اجڑے ہوئے کھیت، ٹوٹی ہوئی کشتیاں گزرے لمحات کی داستاں ہیں / دھڑکتے ہوئے دل، مہکتے ہوئے ہونٹ، شاداب چہروں کے گلشن کہاں ہیں؟ / عظیم لہرو، عظیم لمحوں کی ہمسفیرو! / کھڑا ہوا ہوں تمہارے پہلو میں اپنے خوابوں کی راکھ لے کر / یہ قلبِ ویراں بہ دیدۂ تر / تمہاری آغوش کاش بن سکتی میری منزل“۔[11]

نظم کے نویں حصہ کا موضوع قحطِ بنگال ہے شاعر نے بنگال کو صرف ایک سیاح کی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ جسے بنگال کے لوگوں سے بنگال کی مٹی سے، بنگال کے دریاؤں سے، بنگال کے فنکاروں سے، بنگال کی درس گاہوں سے پیار ہے بھوک سے مرتے ہوئے لوگ شاعر کے اپنے ہیں بلکہ اس کے وجود اور روح کا حصہ ہیں۔ اس حصے میں شاعر کے دل کا کرب نمایاں ہے۔ نظم کا یہ حصہ ایک طرح سے بنگال کے لوگوں کا مرثیہ بن گیا ہے شاعر نے قحط بنگال کو رضائے الٰہی نہیں سمجھا بلکہ اس قحط کے پس پشت کارفرما عناصر کی نشاندہی کی ہے۔

”یہ کس کی آواز وقت کے بیکراں اندھیروں میں تیرتی ہے / یہ کون اس جشن مرگ میں گیت گا رہا ہے / ضمیر عالم کو ہائے نغمہ کی ٹھوکروں سے جگا رہا ہے / ضمیر عالم، جو سو چکا ہے جو مر چکا ہے / اللہ بھات دے / اللہ بھات دے، کو دپڑے، بانچے دے دے ٹوٹی / ہم نگری نگری کے پالک ہم ہی بھات نہ کھائیں / یہ دھنوان ہمارے منہ سے دانہ تک لے جائیں / اللہ بھات دے / اللہ بھات دے / کہیں بنا ہم کام کریں اور جھیلیں ماگھ کی شیت / دُکھیوں کو دکھ دینا مولا شاید تیری دیت / اللہ بھات دے“۔[12]

اس دعا میں اہل بنگال کے دکھ حسرتیں اور غم سبھی سمٹ آئے ہیں ہر آنکھ اشک بار ہے بھوک کا زہر رگ رگ میں پھیل چکا ہے گاؤں کے گاؤں قحط سالی کی نظر ہو چکے ہیں اور شام الم کے سالوں نے بستیوں کو خرابوں میں بدل دیا ہے لوگ قوت کے اندھیروں سے بچنے کے لئے زندگی کی شمع کی تلاش میں سرگرداں ہیں ہر طرف تباہی و بربادی کے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ انسانیت کی روح لرز کر رہ جاتی ہے۔

”کہیں درختوں کے سائے میں نیم پردہ ڈھانچے پڑے ہوئے ہیں / اور ان کے گرد ایک غول کا منظر ہے کہ مانس ٹوٹے / ہزاروں انسان نما ہیں غریب گھر کی طرف رواں ہیں / یہ آس لے کر، کس طرح ہاتھ سے نہ جیون کی ڈور چھوٹے“۔[13]

نظم کا یہ حصہ فضل کریم احمد فضلی کے ناول ”خونِ جگر ہونے تک“ کی یاد دلاتا ہے اس ناول کا موضوع بھی قحط بنگال ہے اگرچہ فضلی صاحب نے قحط بنگال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر ریاض انور نے قحط کے شکار لوگوں کے کرب کو محسوس کیا اور اپنے تخیل سے ایسے مناظر تخلیق کئے جو حقیقت کے بہت قریب ہیں۔

”یہ زندگی کی لکڑی ہے، ٹیگور کی سرزمین ہے / یہ فردوہیں سے بھی زیادہ حسین ہے / یہاں رقص ہیں، گیت ہیں، قہقہے ہیں / مگر ان کے سائے میں دُکھ کے الاؤ، / ازل سے دہکتے چلے آرہے ہیں! / اور اس آگ کی روشنی میں سدا / زیست کے ہانپتے کانپتے قافلے / موت کی رہگزر سے گزرتے رہیں گے / ہواؤں سے سیلاب سے قحط سے“۔[14]

حرف و سخن HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

نظم کے دسویں حصے میں چائے باگان (چائے کے باغات) کے حوالے سے نو آبادیاتی نظام کے ہتھکنڈوں پر گہرا طنز کیا گیا ہے شاعر نے چائے کے باغات کو گورے آقاؤں کے گناہوں کی یاد قرار دیا ہے۔ انگریز حکمرانوں نے اپنے مفادات کے لیے ارض بنگال کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا حکمران طبقے نے افرادی قوت کو اپنے سیاسی اثرورسوخ کے بل بوتے پر حاصل کیا اور محنت اور سرمایہ کے تضاد کی عجیب وغریب مثال قائم کی۔

"یہ چائے باگان گورے آقاؤں کے گناہوں کی یادگاریں / ہری بھری وادیوں میں نوحہ کناں ہیں غیر فشاں بہاریں / مہک ہواؤں میں برگِ گُل بن کے راکھ خوابوں کی ترقی ہے / مہکتی، سسکاتی بے کراں زندگی کے کمخواب ہائے شیریں"۔[15]

شاعر کو احساس ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے بنگال کے قدرتی حسن کو گہنا دیا ہے۔ نئے بنگال میں جگنوؤں، ستاروں اور چراغوں کی روشنی کی جگہ 'برقی قمقموں' کی بے کیف روشنی نے لے لی ہے۔ کشتیوں کی جگہ دھوئیں اگلتے ہوئے سٹیمر آ گئے ہیں۔ ندی کے ساحل پر ملاحوں کے گیتوں کی بجائے کرینوں کا شور محشر برپا ہے۔ ٹرینوں کے انجنوں کی مہیب چیخوں میں خوش آواز کلاکاروں کی آوازیں دب گئی ہیں۔ نئے بنگال میں جھومتے پیڑوں، ہرے کنجوں، سبز ازادوں اور پر اسرار شبستانوں کی جگہ ریستوران، تھیٹر، کلب اور شراب خانے بن گئے ہیں۔ گویا یہ "شہر خدا سکون قلب و نظر" کا دشمن بن گیا ہے۔ اس بند میں شاعر نے قدیم اور جدید بنگال کا تقابل کیا ہے۔ شاعر کی ہمدردیاں قدرت کی آغوش میں سوئے ہوئے اور مانجھیوں کے گیتوں سے مہکتی فضا رکھنے والے بنگال کے ساتھ ہیں، بنگال کی قدیم تہذیب اس قدر مسحور کن ہے کہ شاعر وقت کے ساتھ پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں۔ یہ شہر گل اب حیات نو کی ہماہمی سے دھڑک رہا ہے یہ برق کے قمقموں کی بے کیف روشنی سے بھڑک رہا ہے۔ ندی میں بہتے ہوئے سٹیمر دھوئیں کے بادل اُگل رہے ہیں جو نیلگوں آسمان کے دامن پر داغ بن کر مچل رہے ہیں ندی کے ساحل پر گڑگڑاتے ہوئے کرینوں کا شور محشر یہ کھڑکھڑاتی ہوئی ٹرینیں یہ انجنوں کی مہیب چیخیں !

نظم کے اختتامیہ حصہ کا بنیادی موضوع بنگال کی تاریخ ہے۔ شاعر نے بنگال کی تاریخ کو آنسو کا سفر قرار دیا ہے۔ شاعر نے بنگال میں زیست کرنے والوں کو ایسی شکستہ کشتی سے تشبیہ دی ہے جو بحرِ بیکراں کی مہیب لہروں میں گھری ہوئی ہے بنگال کے حوالے سے شاعر کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ بنگال قدرتی حسن اور عظیم اہل علم وہنر کی وجہ سے دنیا میں اپنی مثال آپ ہے بنگال کی عظمت کے حوالے سے حریم سخن کے باب میں ٹیگور، مدن بول، جلال شاہ، فقیر لالن شاہ اور گیروی چادروں میں لپٹے قلندروں کا حوالہ دیا ہے یہ سب انسانیت اور امن کے پیامبر تھے شاعر نے فقیر لالن کے ایک مرشدی کے گیت کا مفہوم بھی اس نظم میں منظوم کیا ہے۔ جو ایک طرح سے خدائے واحد کی عظمتوں کا اعراف ہے۔

"سوچ سمجھ کر بھگت بنو تم / دل کے پاس اسے دیکھو تم / لالن کہوے / اپنا آپ جو ڈھونڈو تمانتا دور تو نائیں / ہے کس دیس میں غم کا مداوا سائیں"۔[15]

اس کے بعد شاعر نے بنگال میں تجارت کی آڑ میں انگریزوں کی آمد اور نو آبادیاتی نظام نے اہل بنگال پر ڈھائے جانے والے مظالم کو پرتاثیر انداز میں بیان کیا ہے انگریزوں نے اہل بنگال کو معاشی سطح پر جو نقصان پہنچایا اس کا ازالہ ناممکن ہے۔ شاعر کے نزدیک اہل فرہنگ نے اس حسین خیاباں کو جہنم بنا دیا تھا۔ اہل ہنر وفن کے ہاتھ اس لئے کاٹ دیئے گئے کہ وہ حسنِ تخلیق کا جرم کر رہے تھے۔ ڈھاکہ میں اس لئے کھڈیاں جلادی گئیں کہ مغرب کی اشیاء کی مانگ میں اضافہ ہو جائے۔ یہاں ہر ایک گھر کی روشنی اس لیے بجھادی گئی کہ بلادِ مغرب کے در و بام جگمگاتے رہیں۔ بنگال کی پہچان دھان کی فصلیں برباد کر کے نیل کی کاشت کا حکم دے دیا گیا کمپنی بہادر کا حکم نہ ماننے کی کم سے کم سزا سرِ عام کوڑوں کی سزا قرار پائی اہل بنگال کے چہروں پر بے بسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے ایسے ماحول میں سراج الدولہ بریندر ناتھ گوش جیسے بنگال کے سپوت اہل فرہنگ کے سامنے ڈٹ گئے لیکن میر جعفر جیسے کور دل غدار نے وطن کی تقدیس اپنی ذاتی راحت اور فائدے کے لیے بیچ ڈالی لیکن اہلِ بنگال کے دلوں میں اٹھنے والا آزادی کا شعلہ ابو القاسم فضل الحق، عبد الحمید بھاشانی، سورنگ پور نیشنل سکول اور تحریک آزادی کے ترجمان اخبار 'جوگنترا' اپنی اپنی جگہ صبحِ نو کی خوشخبری دیتے رہے ان لوگوں نے جگہ جگہ سڑکوں پر ایستادہ پھانسیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے وطن کی تقدیس کے گیت گائے اور ہنستے کھیلتے محبسِ شبِ غم کے آستاں سے گزر گئے۔

”مگر شکستِ قفس کا جذبہ / سدا سلگتا رہا ہے دل میں ! / کبھی یہ نذرل کے لب سے اک شعلہ بن کے لپکا / کبھی یہ قاسم کی آنکھ سے اشک بن کے لپکا ! / کبھی یہ عبد الحمید بھاشانی بن کے گرجا / مداری پور، باریسال، سورنگ پور، کھلنا / نگر نگر ظلمتوں سے لڑتے رہے اجالے / جو گنترِ صبحِ نو کی آواز بن کے ابھرا / لرزاٹھے جس اجنبی حاکموں کے ایواں“۔[17]

ریاض انور کی یہ نظم کئی حوالوں سے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دی جاسکتی ہے نظم کا موضوع اگرچہ مشرقی پاکستان کی سرزمین ہے لیکن پس منظر میں ان تمام اقوام کی کہانی موجود ہے جو استعماری قوتوں کے نرغے میں صدیوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔ خواب دیکھنے والے محنت کش لوگ کس طرح غربت اور بے یقینی کے دھند لکوں میں گم ہو جاتے ہیں اس نظم میں بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں تیرہ حصوں پر مشتمل یہ نظم ارضِ بنگال کی سیاسی، سماجی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ شاعر نے نظم کے ہر حصہ کیلئے الگ الگ موضوع چُنا ہے۔ لیکن یہ تمام موضوعات مل کر ارضِ بنگال کی ایک مکمل تصویر بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔ شاعر نے بنگال کو ہر حوالے سے دیکھا ہے۔ ریاض انور اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”میں نے بنگال کو ہر زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اس کے درخشاں ماضی میں جھانکا ہے اور خون تھوکتے ہوئے ’حال‘ کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں سے پھوٹتی ہوئی روشنیوں میں جھونپڑوں میں دم توڑتے ہوئے انسانوں کو بھی دیکھا ہے اس کے مانجھیوں کی اداس آوازوں میں آواز ملا کر بھٹیالی کے مدھر گیت گائے ہیں دھان کے مٹیالے کھیتوں میں چاشیوں کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرتی ہوئی ناریوں کے ساتھ قدم ملا کر لمحوں کی رفتار کو روکنے کی کوشش کی ہے اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر سراپا احتجاج، شعلہ بار آنکھوں اور بھنچتی ہوئی مٹھیوں والے پر غیض ہجوم کے ساتھ زندگی کی دھڑکن بھی محسوس کی ہے“۔[18]

’آوازوں کا بھنور‘ جیسی طویل نظم کے علاوہ ریاض انور نے اس مجموعہ میں مختصر نظمیں بھی شاملہیں جن میں ”روشنی کی تلاش، لمحوں کی موت، ایک موت ایک احتجاج، جب چلی سرد ہوا، خلش، میراث، مقامِ آخرِ شب“ شامل ہیں۔

نظم ’ایک موت ایک احتجاج‘ ریاض انور کی فکری اور نظریاتی جہت کو اجاگر کرنے والی ایک نمائندہ نظم ہے ریاض انور ایک انسان دوست نظریات رکھنے والے تخلیق کار تھے جو سرحدوں کی قید سے ماوراتھے دنیا میں جہاں کہیں بھی مظلوموں پر تشدد اور قتل غارت کا بازار گرم کیا گیا ریاض انور پوری صداقت اور شدت کے ساتھ سراپا احتجاج نظر آئے ریاض انور فنونِ لطیفہ خصوصاً شاعری اور موسیقی کو قوموں کے درمیاں فاصلوں کو کم کرنے کا ایک زریعہ سمجھتے تھے اس قسم کی کوشش انہوں نے پوربی اور پچھمی پاکستان کی عوام کو قریب لانے کیلئے ساٹھ کی دہائی میں بڑی شدومد کے ساتھ کی تھی فنکاروں اور کلاکاروں کے ساتھ محبت کرنے والا یہ شاعر میریلن منرو کی موت پر کیونکر خاموش رہ سکتا تھا میریلن منرو (1936ء–1962ء) امریکی اداکارہ، گلوکارہ اور ماڈل تھیں۔ جن کی ضرورت سے زیادہ دوا کے استعمال کے باعث موت واقع ہو گئی جسے باضابطہ طور پر خودکشی قرار دیا گیا لیکن قتل کا شبہ بھی خارج از امکان نہیں۔ ریاض انور نے اس موت پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا اس لیئے نظم کا عنوان ایک موت ایک احتجاج رکھا جو فنی اور جمالیاتی لحاظ سے بھی بہت پر اثر ہے اس نظم میں میریلن منرو کی شخصیت فکر اور نظریات کی ترجمانی بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ کی گئی۔

”بسترِ مرگ پہ ساکت ہے وہ نقش مانی / جس کی پرنور جوانی کو ہوس کاروں نے / معبد فن کے خداؤں نے جہانداروں نے / ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے سرداروں نے / قریہ قریہ سرِ سربازار کیا تھا نیلام / گردشِ وقت کے دامن پہ رہے گا الزام“۔[19]

’جب چلی سرد ہوا‘ کا موضوع بے یقینی اور روح کی گہرائیوں سے جنم لینے والا احساس محرومی ہے اس نظم میں شاعر نے داخل اور خارج کو ملا کر ایک ایسی فضا تشکیل دی ہے جو ہماری جانی پہچانی ہے انسانی جذبات کو مظاہر فطرت کے اداس اور متاثر کن احساس سے ملا کر ایسی فضا قائم کی ہے جس نے ہر طرف اداسی اور تنہائی کے احساس کو گہرا کر دیا ہے اپنی ذات کی تلاش میں سرگرداں شاعر ہوا کی جبینِ ناز پر اپنا نام تلاش کرتا پھرتا ہے اپنی شناخت کا یہ سفر گہرے غم اور اٹوٹ تنہائی کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے شاعر نے ہوا کے دوش پر اڑتے پتوں کو اپنی بے مصرف زندگی سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے خشک پتے کو بہ کو، قریہ بہ قریہ اپنی مرضی کے خلاف ہوا کے رحم وکرم پہ اڑتے ہیں اسی طرح دکھوں غموں کے لمبے

سلسلے شاعر کو دربدر اور بے چین رکھتے ہیں۔ اپنی اس حالت پر خود شاعر کو بھی رحم آتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے۔ 'ہائے اپنی زندگی' نظم کی آخری لائن میں جس غم انگیز فضا اس کی انتہائی شکل پر دکھایا گیا ہے یاسیت اور قنوطیت کی ایسی تصویر بن گئی ہے جس میں اپنی حالت کا ادراک بھی شامل ہے اگرچہ یاسیت اور ادراک دو مختلف چیزیں ہیں لیکن شاعر نے ان دونوں کے مفہوم کو اس طرح ملا دیا ہے کہ نظم میں جمالیاتی قدر پیدا ہو گئی ہے۔

'پیمانِ وفا' میں ظالموں اور اہلِ دل لوگوں کی اس روایتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے شاعر نے اپنی ذات کو پر اثر بنانے کیلئے مظاہر فطرت کو اپنے جذبات ہم آہنگ کر کے دیکھا ہے اگرچہ یہ طریقہ ریاض انور کی بیشتر نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً 'لمحوں کی موت' 'جب چلی سرد ہوا' میں لیکن اس نظم میں شاعر کے نظریات اور اس کا نقطہ نظر زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ نظم کے موضوع اور اسلوب پر فیض احمد فیض کی نظموں کے اسلوب کا اثر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

"ہم کہ جو نقدِ دل و جاں کے ساتھ / درد کے راہوں پر تھے محو سفر / اپنے ہی آدرش سے شرما گئے / ہنس رہا ہے وقت کا زخمی کنول / زندگی کی اس سنہری مات پر / اہل دل پھر بھی رواں ہیں سوئے دار / تحفہ جاں لے کے اپنے ہاتھ پر"۔[20]

نظم 'ہمسفر' بھٹیالی کی طرز پر لکھی گئی ہے لوک گیتوں کا انداز لیئے ہوئے یہ نظم اسلوبیاتی حوالے سے ریاض انور کی دوسری نظموں سے مختلف ہے چھ اشعار پر مشتمل یہ نظم مثنوی کے فنی نظام کا بھی تتبع کرتی نظر آتی ہے ہر شعر اپنے الگ قوافی رکھتا ہے

اس نظم میں محبوب کے حوالے سے ریاض انور کا محبوب رومانوی اور داستانوی ہے ریاض انور کا محبوب نیلے آکاش کا باسی اور اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر دیس دیس گھومنے والا ہے محبوب کے ہونٹوں سے پھول مہکتے ہیں اور اس کے میٹھے بول میں پائل کی سی جھنکار ہے اس کی زلفوں کی خوشبو ساون کی بدلی کی صورت نگری نگری گھومتی ہے محبوب کی چال میں پون کا البیلا لہراؤ اور پدما کی لہروں پر بہتی ہوئی کشتی کی طرح ہے محبوب کی چتون کی چندا نے سب کو راہ دکھلائی ہے لیکن خود محبوب کو اپنی منزل حاصل نہ ہو سکی اتنی صفات کا حامل محبوب دراصل ایک زخمی دل رکھتا ہے جو اپنے درد کو چھپانے کے لئے دوسروں کا دل بہلاتا ہے آخر میں شاعر کا انداز رومان سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہے اور یہی اس نظم کا خوبصورت پہلو ہے۔

"تیری چتون کے چندا نے سب کو راہ دکھائی / لیکن تیرے پیار کی منزل تیرے ہاتھ نہ آئی! / جانے اپنے زخمی دل میں کتنے درد چھپائے / دوجے کا دل بہلانے کو تو پل پل مسکائے"۔[21]

نظم 'قاتل کو پہچانو' میں شاعر کا آدرش اور اس کے نظریات ایک ایسے پیامبر کی شکل میں سامنے آئے ہیں جس میں اندھیروں کے شہر میں لفظوں کی قندیلیں اٹھا رکھی ہیں معاشی اور سماجی استحصال کا شکار لوگوں کو وہ اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا ہے وہ اندھیروں میں صدیوں سے راہ گم کردہ مسافروں کو روشنی کے دیس میں پہنچانا چاہتا ہے یا اس دیس کی طرف سے رہنمائی کرنا چاہتا ہے شاعر صدیوں سے ظلم سہنے والے لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے یہاں شاعر کا لہجہ خطابیہ انداز اختیار کر لیتا ہے۔

"اندھیارے میں خود کو کب تک ڈھونڈو گے / دیواروں سے کب تک یوں سر پھوڑو گے / آؤ میرے ساتھ چلو تم / گرچہ میرے ہونٹ سلے ہیں، پھر بھی / میرے ہاتھوں میں روشن ہیں / آج بھی لفظوں کی قندیلیں / ان سے پھوٹتی روشنی مدھم لہروں میں / خود کو دیکھو، اپنے قاتل کو پہچانو"۔[22]

اپنی طویل نظم "آوازوں کا بھنور' میں ریاض انور نے جو فکری اور فنی لوازمات کو ملحوظ رکھا ہے اور جس وسیع کینوس کو اپنی تخلیق کے لئے منتخب کیا ہے۔ وہ ان کی مختصر نظموں میں ناپید ہے۔ اگرچہ ان کی نظموں میں بھی زندگی اور فن کی متنوع جہات کو بھرپور تخلیقی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان میں بھی شاعر کی حیات اور تجربات کے مختلف گوشوں کی گرہ کشائی ہوئی ہے مگر ریاض انور ان نظموں میں 'آوازوں کا بھنور' جیسی جمالیات کی تخلیق میں اس حد تک کامیاب نظر نہیں آتے ریاض انور کی مختصر نظموں کے موضوعات اگرچہ متنوع ہیں لیکن دکھ، یاسیت، اور تنہائی ایک طرح سے ان نظموں کے مشترک موضوعات ہیں۔ ریاض انور کی نظم "آوازوں کا بھنور" اُردو طویل

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

نظم کی روایت میں بلاشبہ ایک انوکھا تجربہ ہے جو اپنے تخلیق کار کی طرح ایسے نقد ادب کے جوہری کی منتظر ہے جو اس نظم اور اس کے تخلیق کار کو قعرِ گمنامی سے نکال کر صحیح مقام عطا کر سکے۔

حوالہ جات

1۔ سر سید احمد خان، مقالات سر سید، مرتبہ اسمعیل پانی پتی، (لاہور: مجلس ترقی ادب، 1963ء)، ص89
2۔ محمد حسین آزاد، مقالات آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر، (لاہور: مجلس ترقی ادب، 1966ء)، ص121
3۔ شمیم حنفی، خیال کی مسافت، (کراچی: شہزاد، 2003ء)، ص60
4۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو نظم نظریہ و عمل 1936ء تا 1970ء، (ملتان: بیکن بکس، 2014ء)، ص173
5۔ ریاض انور، آوازوں کا بھنور، (لاہور: گوشہ ادب، 1968ء)، ص20
6۔ ایضاً، ص۲۲
7۔ ایضاً، ص27
8۔ ایضاً، ص29
9۔ ایضاً، ص32
10۔ ایضاً، ص34
11۔ ایضاً، ص39
12۔ ایضاً، ص45
13۔ ایضاً، ص48
14۔ ایضاً، ص51
15۔ ایضاً، ص56
16۔ ایضاً، ص59
17۔ ایضاً، ص63
18۔ ریاض انور، آوازوں کا بھنور، دیباچہ، (لاہور: گوشہ ادب، 1968ء)، ص6
19۔ ریاض انور، ایک موت ایک احتجاج، آوازوں کا بھنور، ایضاً، ص76
20۔ ریاض انور، پیمانِ وفا، آوازوں کا بھنور، ایضاً، ص88
21۔ ریاض انور، ہمسفر، آوازوں کا بھنور، ایضاً، ص94
22۔ ریاض انور، قاتل کو پہچانو، آوازوں کا بھنور، ایضاً، ص103

ماخذ

۱۔ ریاض انور، آوازوں کا بھنور، (لاہور: گوشہ ادب، 1968ء)
۲۔ شمیم حنفی، خیال کی مسافت، (کراچی: شہزاد، 2003ء)

۳۔ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو نظم نظریہ و عمل1936ء تا1970ء،(ملتان:بیکن بکس،2014ء)

4۔ سرسید احمد خان، مقالات سرسید، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی،(لاہور: مجلس ترقی ادب،1963ء)، ص89

5۔ محمد حسین آزاد، مقالات آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر،(لاہور: مجلس ترقی ادب،1966ء)، ص121